سانحہ کربلا اور حضرت حسین ویزید

﴿شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ کی نظر میں﴾

سانحۂ شہادت حسین رضی اللہ عنہ اور واقعات کربلا کے موضوع پر آج سے کئی صدیاں قبل شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ (۶۶۱۔۷۲۸ھ) نے جو کچھ لکھا تھا، وہ حق واعتدال کا ایک بہترین نمونہ، دلائل و براہین کا نادر مرقع اور خداداد فہم صحیح کا شاہکار ہے، انہوں نے اپنی تالیفات میں متعدد مقامات پر اس کو موضوع بحث بنایا ہے۔ بالخصوص "منہاج السنۃ" میں اس پر بڑی عمدہ بحث فرمائی ہے جس کی ضروری تلخیص مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی مرحوم نے اردو میں کر کے شائع کر دی تھی۔ اس کی اہمیت وافادیت کے پیش نظر ہم ذیل میں امام موصوف کی وہ ترجمہ شدہ تحریر قدرے ترمیم کے ساتھ پیش کر رہے ہیں، آیات واحادیث کے عربی الفاظ کا، اصل کتاب سے مراجعت کر کے، ہم نے اضافہ کر دیا ہے۔

تمہید: علماء اسلام میں کوئی ایک بھی یزید بن معاویہ کو ابو بکر، عمر، عثمان اور علی کی طرح خلفائے راشدین میں سے نہیں سمجھتا۔ حدیث میں آیا ہے کہ:

((خلافۃ النبوۃ ثلاثون سنۃ ثم یؤتی اللہ الملک من یشآء)) (سنن أبي داؤد السنۃ، باب فی الخلفاء، ح:۴۶۴۷)

"خلافت تیس برس تک منہاج نبوت پر رہے گی پھر سلطنت ہو جائے گی۔"

علماء اہل سنت اس حدیث کے مطابق یزید اور اس جیسے آدمی اور عباسی خلفاء کو محض فرمانروا بادشاہ اور اسی معنی میں خلیفہ خیال کرتے ہیں۔ ان کا یہ خیال بالکل درست ہے۔ یہ ایک محسوس واقعہ ہے جس سے انکار غیر ممکن ہے کیونکہ یزید اپنے زمانے میں عملاً ایک بادشاہ، حکمران، ایک صاحب سیف اور خود مختار فرمانروا تھا۔ اپنے باپ کی وفات کے بعد تخت پر بیٹھا اور شام، مصر، عراق خراسان وغیرہ اسلامی ممالک میں اس کا حکم نافذ ہوا۔ حضرت حسین قبل اس کے کہ کسی ملک پر بھی حاکم ہوں، یوم عاشوراء ۶۱ھ میں شہید ہو گئے اور یہی یزید کی سلطنت کا پہلا سال ہے۔

حضرت عبداللہ بن زبیر: بلاشبہ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے یزید سے اختلاف کیا اور باشندگان مکہ وحجاز نے ان کا ساتھ دیا لیکن یہ واقعہ ہے کہ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے خلافت کا دعوی یزید کی زندگی میں نہیں کیا بلکہ اس کے مرنے کے بعد کیا۔ یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ شروع شروع میں اختلاف کرنے کے باوجود عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ یزید کے جیتے جی ہی اس کی بیعت پر رضامند ہو گئے تھے مگر چونکہ اس نے یہ شرط لگادی تھی کہ قید ہو کر ان کے حضور میں حاضر ہوں اس لیے بیعت رہ گئی اور باہم جنگ برپا ہوئی۔ پس اگرچہ یزید تمام بلاد اسلامیہ کا حکمران نہیں ہوا۔ اور عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کا ماتحت علاقہ اس کی اطاعت سے

برابر گشتہ رہا، تاہم اس سے اس کی بادشاہت اور خلافت میں شبہ نہیں ہو سکتا کیونکہ خلفائے ثلاثہ ابو بکر، عمر، عثمان اور پھر معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہم، عبدالملک بن مروان اور اس کی اولاد کے سوا کوئی بھی اموی یا عباسی خلیفہ پورے بلاد اسلامیہ کا تنہا فرمانروا نہیں ہوا۔ حتیٰ کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں بھی تمام دنیائے اسلام کی حکومت نہ تھی۔

بادشاہوں پر خلیفہ کا اطلاق؟ پس اگر اہل سنت ان بادشاہوں میں سے کسی کو خلیفہ یا امام کہتے ہیں تو اس سے مقصود صرف یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے زمانے میں خود مختار تھا، طاقتور تھا، صاحب سیف تھا۔ عزل و نصب کرتا تھا، اپنے حکام کے اِجراء کی قوت رکھتا تھا۔ حدود شرعی قائم کرتا تھا کفار پر جہاد کرتا تھا۔ یزید کو بھی امام و خلیفہ کہنے سے یہی مطلب ہے اور یہ ایک ایسی واقعی بات ہے کہ اس کا انکار غیر ممکن ہے۔ یزید کے صاحب اختیار بادشاہ ہونے سے انکار کرنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی اس واقعے سے انکار کر دے کہ ابو بکر، عمر، عثمان رضی اللہ عنہم حکمران نہیں تھے یا یہ کہ قیصر و کسریٰ نے کبھی حکومت نہیں کی۔

یہ "خلفاء معصوم نہ تھے: رہا یہ مسئلہ کہ یزید، عبدالملک، منصور وغیرہ خلفاء نیک تھے یا بد؟ صالح تھے یا فاجر؟ تو علماء اہل سنت نہ انہیں معصوم سمجھتے ہیں نہ ان کے تمام احکام و اعمال کو عدل و انصاف قرار دیتے ہیں اور نہ ہر بات میں ان کی اطاعت واجب تصور کرتے ہیں۔ البتہ اہل سنت والجماعت کا یہ خیال ضرور ہے کہ عبادت و طاعت کے بہت سے کام ایسے ہیں جن میں ہمیں ان کی ضرورت ہے۔ مثلاً یہ کہ ان کے پیچھے جمعہ و عیدین کی نمازیں قائم کی جاتی ہیں۔ ان کے ساتھ کفار پر جہاد کیا جاتا ہے امر بالمعروف و نہی عن المنکر اور حدود شرعیہ کے قیام میں ان سے مدد ملتی ہے نیز اسی نوع کے دوسرے معاملات ہیں، اگر حکام نہ ہوں تو ان اعمال کا ضائع ہو جانا اغلب ہے بلکہ ان میں سے بعض کا موجود ہونا ہی غیر ممکن ہے۔

نصب امام کے چند اصول: اہل سنت کے اس طریقہ پر کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا کیونکہ اعمال صالحہ انجام دینے میں اگر نیکوں کے ساتھ برے بھی شامل ہوں تو اس سے نیکوں کے عمل کو ذرا بھی نقصان نہیں پہنچ سکتا۔ بلاشبہ یہ بالکل درست ہے کہ اگر عادل صالح امام کا نصب ممکن ہو تو فاجر و مبتدع شخص کو امام بنانا جائز نہیں، اہل سنت کا بھی یہی مذہب ہے لیکن اگر ایسا ممکن نہ ہو بلکہ امامت کے دونوں مدعی فاجر اور مبتدع ہوں تو ظاہر ہے کہ حدود شرعیہ و عبادات دینیہ کے قیام کے لیے دونوں میں سے زیادہ اہلیت و قابلیت والے کو منتخب کیا جائے گا۔ ایک تیسری صورت بھی ہے اور وہ یہ کہ اگر کوئی ایسا شخص موجود ہو جو صالح ہو مگر سپہ سالاری کے فرائض و واجبات ادا کرنے کا اہل نہ ہو۔ اس کے خلاف ایک فاجر شخص ہو جو بہترین طریق پر فوجوں کی قیادت کر سکتا ہو تو جس حد تک جنگی مقاصد کا تعلق ہے، یقیناً اسی آخر الذکر یعنی فاجر کو سربراہ بنانا پڑے گا۔ نیکی کے کاموں میں اس کی اطاعت و امداد کی جائے گی۔ بدی اور برائی میں اس پر اعتراض و انکار کیا جائے گا۔

حفظ مصالح اور دفع مفاسد: غرض امت کی مصلحتوں کا لحاظ مقدم ہے اگر کسی فعل میں بھلائی اور برائی دونوں موجود ہوں تو دیکھا جائے گا کہ کس کا پلہ بھاری ہے اگر بھلائی زیادہ نظر آئے تو اس فعل کو پسند کیا جائے گا۔ اگر برائی غالب دکھائی دے تو اس کے ترک کو ترجیح دی جائے گی۔ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو اس لیے مبعوث فرمایا تھا کہ مصالح کی تائید و تکمیل فرمائیں اور مفاسد مٹائیں یا کم کریں۔ یزید، عبدالملک اور منصور جیسے خلفاء کی اطاعت اسی لیے کی گئی کہ ان کی مخالفت میں امت کے لیے نقصان، نفع سے زیادہ تھا۔ تاریخ شاہد ہے کہ ان خلفاء پر جن لوگوں نے خروج کیا ان سے امت کو سراسر نقصان ہی پہنچا، نفع ذرا بھی نہیں ہوا۔ بلاشبہ ان خروج کرنے والوں میں بڑے بڑے اخیار و فضلاء بھی شامل تھے مگر ان کی نیکی و خوبی سے ان کا یہ فعل لازماً مفید نہیں ہو سکتا۔ انہوں نے اپنے خروج سے نہ دین کو فائدہ پہنچایا اور نہ دنیوی نفع ہی حاصل کیا۔ اور معلوم رہے کہ اللہ تعالیٰ کسی ایسے فعل کا حکم نہیں دیتا جس میں نہ دنیا کا بھلا ہو نہ دین کا، جن لوگوں نے خروج کیا ان سے کہیں زیادہ افضل حضرت علی، طلحہ، زبیر، عائشہ وغیرہم صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین تھے مگر خود انہوں نے اپنی خونریزی پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔

عہد فتن میں خروج کی ممانعت: یہی وجہ ہے کہ حسن بصری حجاج بن یوسف ثقفی کے خلاف بغاوت سے روکتے تھے اور کہتے تھے "حجاج اللہ کا عذاب ہے اسے اپنے ہاتھوں کے زور سے دور کرنے کی کوشش نہ کرو بلکہ اللہ کے سامنے تضرع و زاری کرو کیونکہ اس نے فرمایا ہے:

﴿وَلَقَدْ أَخَذْنَاهُم بِالْعَذَابِ فَمَا اسْتَكَانُوا لِرَبِّهِمْ وَمَا يَتَضَرَّعُونَ﴾ (المؤمنون۲۳/۷۶)

"ہم نے ان کی عذاب کے ذریعے گرفت کی۔ انہوں نے پھر بھی اپنے رب کے سامنے نہ عاجزی کا اظہار کیا اور نہ اس کے حضور گڑگڑائے۔"

اسی طرح اور اخیار و ابرار بھی خلفاء پر خروج اور عہد فتنہ میں جنگ سے منع کیا کرتے تھے جیسا کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ، سعید بن المسیب، حضرت زین العابدین، علی بن حسین وغیرہم اکابر صحابہ و تابعین جنگ حرہ کے زمانے میں یزید کے خلاف بغاوت کرنے سے روکتے تھے۔ احادیث صحیحہ بھی اسی مسلک کی مؤید ہیں اسی لیے اہل سنت کے نزدیک یہ تقریباً متفق علیہ مسئلہ ہے کہ عہد فتن میں قتال و جدال سے اجتناب اور جور ائمہ پر صبر کیا جائے، وہ یہ مسئلہ اپنے عقائد میں بھی ذکر کرتے رہے ہیں اور جو شخص متعلقہ احادیث اور اہل سنت کے صاحب بصیرت علماء کے طرز عمل و فکر میں تامل کرے گا اس پر اس مسلک کی صحت و صداقت بالکل واضح ہو جائے گی۔

حضرت حسین کا عزمِ عراق: اسی لیے جب حضرت حسین ؓ نے عراق جانے کا رادہ کیا تو اکابر اہل علم و تقویٰ مثلاً عبداللہ بن عمر ؓ، عبداللہ بن عباس ؓ، ابو بکر بن عبدالرحمن بن حارث ؓ نے ان سے بہ منت کہا کہ وہاں نہ جائیں کیونکہ وہ سمجھتے تھے آپ ضرور شہید ہو جائیں گے۔ حتیٰ کہ روانگی کے وقت بعضوں نے یہاں تک کہہ دیا کہ استودعک اللہ من قتیل "اے شہید! ہم تجھے اللہ کو سونپتے ہیں۔"

اور بعضوں نے کہا:

((لو الشناعة لأمسكتك و منعتک من الخروج))

"اگر بے ادبی نہ ہوتی تو ہم آپ کو زبردستی پکڑ لیتے اور ہرگز جانے نہ دیتے۔"

اس مشورے سے ان لوگوں کے مد نظر صرف آپ کی خیر خواہی اور مسلمانوں کی مصلحت تھی مگر حضرت حسین ؓ اپنے ارادے پر قائم رہے۔ آدمی کی رائے کبھی درست ہوتی ہے اور کبھی غلط ہو جاتی ہے۔ بعد کے واقعات نے ثابت کر دیا کہ حضرت حسین ؓ کو عراق جانے سے روکنے والوں ہی کی رائے درست تھی کیونکہ آپ کے جانے سے ہرگز کوئی دینی یا دنیاوی مصلحت حاصل نہ ہوئی بلکہ یہ مضرت پیدا ہوئی کہ سرکشوں اور ظالموں کو رسول اللہ ﷺ کے جگر گوشے پر قابو مل گیا اور وہ مظلوم شہید کر دیئے گئے۔ آپ کے جانے اور پھر قتل سے جتنے مفاسد پیدا ہوئے وہ ہرگز واقع نہ ہوتے اگر آپ اپنی جگہ پر بیٹھے رہتے کیونکہ جس خیر وصلاح کے قیام اور شر وفساد کے دفعیہ کے لیے آپ اٹھے تھے اس میں سے کچھ بھی حاصل نہ ہوا۔ برعکس اس کے شر کو غلبہ اور عروج حاصل ہو گیا۔ خیر وصلاح میں کمی آگئی اور بہت بڑے دائمی فتنے کا دروازہ کھل گیا جس طرح حضرت عثمان ؓ کی شہادت سے فتنے پھیلے اسی طرح حضرت حسین ؓ کی شہادت نے بھی فتنوں کے سیلاب بہا دیئے۔

حضرت حسین کا مقامِ بلند: اس تفصیل سے ثابت ہوتا ہے کہ نبی کریم ﷺ کا ائمہ و خلفاء کے ظلم پر صبر کرنے اور ان سے جنگ وبغاوت نہ کرنے کا حکم مناسب اور امت کے دین ودنیا کے لیے زیادہ بہتر تھا اور جنہوں نے بالقصد یا بلا قصد اس کی مخالفت کی۔ ان کے فعل سے امت کو فائدہ کے بجائے نقصان ہی پہنچا۔ یہی سبب ہے کہ نبی ﷺ نے حضرت حسن ؓ کی تعریف میں فرمایا تھا:

((إِنَّ ابْنِي هَذَا سَيِّدٌ وَلَعَلَّ اللَّهَ أَنْ يُصْلِحَ بِهِ بَيْنَ فِئَتَيْنِ عَظِيمَتَيْنِ مِنَ الْمُسْلِمِينَ)) (صحیح البخاری، الصلح، ح: ۲۷۰۴)

"میرا یہ فرزند سردار ہے عنقریب خدا اس کے ذریعہ سے مسلمانوں کے دو بڑے گروہوں میں صلح کرائے گا۔"

لیکن اس بات پر کسی شخص کی بھی تعریف نہیں کی کہ وہ فتنہ میں پڑے گا یا خلفاء پر خروج کرے گا یا اطاعت سے برگشتہ یا جماعت سے منحرف ہوگا۔ اس حدیث سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ دو گروہوں میں صلح کرانا اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی نظر میں مستحسن و محبوب ہے اور حضرت حسن رضی اللہ عنہ کا خلافت سے دستبردار ہو کر مسلمانوں کی خونریزی کا خاتمہ کر دینا ان کے فضائل میں ایک عظیم ترین فضیلت ہے کیونکہ اگر خانہ جنگی واجب و مستحب ہوتی تو آنحضرت ﷺ اس کے ترک پر ہرگز تعریف نہ فرماتے۔

یہاں یہ معلوم کرنا بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ نبی ﷺ حضرت حسن رضی اللہ عنہ اور حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کو ایک ساتھ گود میں لے کر فرمایا کرتے تھے۔ "اے اللہ! میں ان دونوں سے محبت کرتا ہوں تو بھی محبت کر۔" چنانچہ جس طرح آپ اپنی محبت میں دونوں کو یکساں شریک کرتے تھے اسی طرح بعد میں یہ دونوں ان خانہ جنگیوں سے یکساں طور پر نفرت کرتے تھے۔ حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ تو جنگ صفین کے دن اپنے گھر بیٹھ رہے تھے اور حضرت حسن رضی اللہ عنہ ہمیشہ اپنے پدر برادر (حضرت علی اور حسین رضی اللہ عنہما) کو جنگ سے باز رہنے کا مشورہ دیتے تھے۔ پھر جب خود بااختیار ہوئے تو جنگ سے دستبردار ہو گئے اور لڑنے والوں میں صلح قائم کر دی۔ خود حضرت علی رضی اللہ عنہ پر بھی آخر میں یہ حقیقت روشن ہو گئی تھی کہ جنگ کے جاری رہنے سے زیادہ اس کے ختم ہو جانے میں مصلحت ہے۔ پھر حضرت حسین رضی اللہ عنہ بھی کربلا پہنچ کر جنگ سے بیزار اور سرے سے دعویٰ امارت و خلافت ہی سے دستبردار ہو گئے تھے اور کہتے تھے "مجھے وطن لوٹ جانے دو۔"

اطاعت فی المعروف: اب یہ بات صاف ہو گئی کہ یزید کا معاملہ کوئی خاص جداگانہ معاملہ نہیں بلکہ دوسرے مسلمان بادشاہوں کا سا معاملہ ہے یعنی جس کسی نے طاعت الٰہی مثلاً نماز، حج، جہاد، امر بالمعروف و نہی عن المنکر اور اقامت حدود شرعیہ میں ان کی موافقت کی اسے اپنی اس نیکی اور اللہ و رسول کی فرمانبرداری پر ثواب ملے گا۔ چنانچہ اس زمانے کے صالح مؤمنین مثلاً حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ وغیرہ کا یہی طریقہ تھا۔ لیکن جس نے ان بادشاہوں کے جھوٹ کی تصدیق کی، اور ان کے ظلم میں مددگار ہوا، وہ گناہ گار ہوا اور زجر و توبیخ اور مذمت اور سزا کا سزاوار۔ یہی باعث ہے کہ صحابہ کرام یزید وغیرہ امراء کی ماتحتی میں جہاد کو جاتے تھے۔ چنانچہ جب یزید نے اپنے باپ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی زندگی میں قسطنطنیہ کا غزوہ کیا تو اس کی فوج میں حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ جیسے جلیل القدر صحابی شریک تھے۔ یہ مسلمانوں کی سب سے پہلی فوج ہے جس نے قسطنطنیہ کا غزوہ کیا ♣ اور صحیح بخاری میں عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

♣ یہ غزوہ ۵۱ھ میں ہوا جس میں حضرت حسین یزید کی ماتحتی میں شریک تھے (البدایہ، ص:۱۵۱، ج:۸) ظاہر ہے اس اثناء میں نمازیں بھی یزید کے

((أَوَّلُ جَيْشٍ مِنْ أُمَّتِي يَغْزُونَ مَدِينَةَ قَيْصَرَ مَغْفُورٌ لَهُمْ)) (صحیح البخاری، الجهاد والسیر، باب ما قیل فی قتال الروم، ح:۲۹۲۴)

"جو فوج سب سے پہلے قسطنطنیہ کا غزوہ کرے گی وہ مغفور یعنی بخشی بخشائی ہے۔"

یزید کے بارے میں افراط و تفریط: اس تفصیل کے بعد اب ہم کہتے ہیں کہ یزید کے بارے میں لوگوں نے افراط و تفریط سے کام لیا ہے ایک گروہ تو اسے خلفائے راشدین اور انبیائے مقربین میں سے سمجھتا ہے اور یہ سراسر غلط ہے دوسرا گروہ اسے باطن میں کافر و منافق بتاتا ہے اور کہتا ہے کہ اس نے قصداً حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو شہید کیا اور مدینہ میں قتل عام کرایا تا کہ اپنے ان رشتہ داروں کے خون کا انتقام لے جو بدر و خندق وغیرہ کی جنگوں میں بنی ہاشم اور انصار ہاتھوں قتل ہوئے تھے اور یہ کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد اس نے یہ شعر پڑھے تھے۔

لما بدت تلك الحمول و أشرفت
تلك الرؤوس على أبي جيرون

"جب وہ سواریاں اور سر ابوجیرون کی بلندیوں پر نمودار ہوئے۔"

نعق الغراب فقلت نح أو لا تنح
فلقد قضيت من النبي ديوني

"تو کوا چلایا۔ اس پر میں نے کہا تو نوحہ کر یا نہ کر میں نے تو نبی سے اپنا قرض پورا پورا وصول کر لیا!"

یا یہ کہ اس نے کہا:

ليت أشياخي ببدر شهدوا
جزع الخزرج من وقع الأسل

"کاش میرے بدر والے بزرگ، نیزوں کی مار سے خزرج وانصار کی دہشت دیکھتے۔"

قد قتلنا القرون من ساداتهم
وعدلنا ببدر فاعتدل

"ہم نے ان کے سرداروں میں چوٹی کے سردار قتل کر ڈالے اور اس طرح بدر کا بدلہ اتار دیا۔"

یہ تمام اقوال سراسر بہتان اور جھوٹ ہیں۔

پیچھے پڑھتے رہے۔(ص،ی)

حقیقت حال: حقیقت یہ ہے کہ یزید مسلمان بادشاہوں میں سے ایک بادشاہ اور دنیادار خلفاء میں سے ایک خلیفہ تھا۔ رہے حسین رضی اللہ عنہ تو بلاشبہ وہ اسی طرح مظلوم شہید ہوئے جس طرح اور بہت سے صالحین ظلم و قہر کے ہاتھوں جام شہادت پی چکے تھے۔ لاریب حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت اللہ اور اس کے رسول کی معصیت اور نافرمانی ہے۔ اس سے وہ تمام لوگ آلودہ ہیں جنہوں نے آپ کو اپنے ہاتھ سے قتل کیا یا قتل میں مدد کی یا قتل کو پسند کیا۔

شہادت کا رتبہ بلند: شہادت حسین رضی اللہ عنہ اگرچہ امت کے لیے بہت بڑی مصیبت ہے لیکن خود حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے حق میں ہر گز مصیبت نہیں، بلکہ شہادت، عزت اور علو منزلت ہے۔ یہ سعادت بغیر مصائب و محن میں پڑے حاصل نہیں ہو سکتی چونکہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دونوں نواسے (حضرت حسین اور حضرت حسن رضی اللہ عنہما) گہوارۂ اسلام میں پیدا ہوئے، امن و امان کی گود میں پلے اور ہولناک مصائب سے دور رہے جن کے طوفانوں میں ان کے اہل بیت مردانہ وار تیرتے پھرتے تھے۔ اس لیے شہداء خوش بخت کے اعلیٰ درجاتِ منازل تک پہنچنے کے لیے انہیں کٹھن مرحلے سے گزرنا ضرور تھا۔ چنانچہ دونوں گزر گئے۔ ایک کو زہر دیا گیا اور دوسرے کے گلے پر چھری پھیری گئی۔

بڑی بڑی اہم شہادتیں: لیکن یہ بھی ملحوظ رہے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا قتل کسی حال میں بھی ان انبیاء کے قتل سے زیادہ گناہ اور مصیبت نہیں جنہیں بنی اسرائیل قتل کرتے تھے۔ اسی طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا قتل بھی ان کے قتل سے زیادہ گناہ اور امت کے لیے زیادہ بڑی مصیبت تھا۔

صبر، نہ کہ جزع فزع: یہ حوادث کتنے ہی دردناک ہوں بہر حال ان پر صبر کرنا، اور ﴿إِنَّا لِلّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعونَ﴾ کہنا چاہیے کیونکہ اس سے اللہ خوش ہوتا ہے۔ فرمایا: ﴿وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ ۞ الَّذِينَ إِذَا أَصَابَتْهُم مُّصِيبَةٌ قَالُواْ إِنَّا لِلّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعونَ ۞﴾ (البقرۃ ۲/۱۵۵-۱۵۶)

"ان صبر گزاروں کو خوشخبری دے دیجئے جب انہیں کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو ان کی زبان پر ﴿إِنَّا لِلّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعونَ﴾ جاری ہو جاتا ہے۔"

ماتم اور بین کرنے والے ہم میں سے نہیں: حدیث صحیح میں آیا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ((لَيْسَ مِنَّا مَنْ لَطَمَ الْخُدُودَ وَشَقَّ الْجُيُوبَ وَدَعَا بِدَعْوَى الْجَاهِلِيَّةِ)) (صحیح البخاری، الجنائز، باب لیس منا۔۔۔، ح: ۱۲۹۴)

"جس نے منہ پیٹا، گریبان چاک کیا اور جاہلیت کے بین کیے وہ ہم میں سے نہیں۔"

نیز نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صالقہ، حالقہ اور شاقّہ سے اپنے تئیں بری بتایا ہے:

((إنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَرِئَ مِنْ الصَّالِقَةِ وَالْحَالِقَةِ وَالشَّاقَّةِ)) (صحیح البخاری، الجنائز، باب ما ینہی من الحلق عند المصیبۃ، ح:۱۲۹۶)

صالقہ بین کرنے والی عورتیں" حالقہ غم سے بال منڈا ڈالنے والی اور شاقّہ گریبان پھاڑنے والی عورتیں۔

نیز فرمایا:

((النَّائِحَةُ إِذَا لَمْ تَتُبْ قَبْلَ مَوْتِهَا تُقَامُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَعَلَيْهَا سِرْبَالٌ مِنْ قَطِرَانٍ وَدِرْعٌ مِنْ جَرَبٍ)) (صحیح مسلم، الجنائز، باب التشدید فی النیاحۃ، ح:۹۳۴)

"نوحہ کرنے والی عورتیں اگر توبہ کے بغیر مر جائیں گے تو انہیں قیامت کے دن خارشی قمیص اور گندھک کا جامہ پہنا کر کھڑا کیا جائے گا۔"

اس قسم کی ایک عورت حضرت عمر کے پاس لائی گئی تو آپ نے اسے مارنے کا حکم دیا۔ سزا کے دوران میں اس کا سر کھل گیا تو لوگوں نے عرض کیا۔ امیر المؤمنین اس کا سر برہنہ ہو گیا ہے۔ فرمایا کچھ پروا نہیں۔

((لا حرمة لها إنها تنهى عن الصبر وقد أمر الله به وتأمر بالجزع وقد نهى الله عنه وتفتن الحي وتؤذي الميت وتبيع عبرتها وتبكي بشجو غيرها إنها لا تبكي على ميتكم إنما تبكي على أخذ دراهمكم))

"اس کی کوئی حرمت نہیں کیونکہ یہ لوگوں کو مصیبت میں صبر کرنے سے منع کرتی ہے حالانکہ اللہ نے صبر کا حکم دیا ہے، اور یہ رونے کی ترغیب دیتی ہے حالانکہ اللہ نے اس سے منع کیا ہے۔ زندہ کو فتنے میں ڈالتی ہے۔ مردہ کو تکلیف دیتی ہے۔ اپنے آنسو فروخت کرتی ہے۔ اور دوسروں کے لیے بناوٹ سے روتی ہے یہ تمہاری میت پر نہیں روتی بلکہ تمہارا پیسہ لینے کے لیے آنسو بہاتی ہے۔"

شہادت حسین رضی اللہ عنہ کے بارے میں افراط و تفریط: جس طرح لوگوں نے یزید کے بارے میں افراط و تفریط سے کام لیا ہے اسی طرح بعضوں نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے بارے میں بے اعتدالی برتی ہے۔ ایک گروہ کہتا ہے۔ (معاذ اللہ!)

"ان کا قتل درست اور شریعت کے مطابق ہوا کیونکہ انہوں نے مسلمانوں میں پھوٹ ڈالنے اور جماعت کو توڑنے کی کوشش کی تھی اور جو ایسا کرے اس کا قتل واجب ہے کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرما چکے ہیں:

((مَنْ أَتَاكُمْ وَأَمْرُكُمْ جَمِيعٌ عَلَى رَجُلٍ وَاحِدٍ يُرِيدُ أَنْ يَشُقَّ عَصَاكُمْ أَوْ يُفَرِّقَ جَمَاعَتَكُمْ فَاقْتُلُوهُ)) (صحیح مسلم، الإمارۃ، باب حکم من فرق أمر المسلمین وھو مجتمع، ح:۱۸۵۲)

"اتفاق کی صورت میں جو تم میں پھوٹ ڈالنے آئے اسے قتل کر ڈالو۔"

حضرت حسین رضی اللہ عنہ بھی پھوٹ ڈالنا چاہتے تھے اس لیے بجا طور قتل کر ڈالے گئے۔"

بلکہ بعضوں نے یہاں تک کہہ دیا کہ "اسلام میں اولین باغی حسین رضی اللہ عنہ ہے۔"

ان کے مقابلے میں دوسرا گروہ کہتا ہے:

"حضرت حسین رضی اللہ عنہ امام برحق تھے ان کی اطاعت واجب تھی ان کے بغیر ایمان کا کوئی تقاضا بھی پورا نہیں ہو سکتا۔ جماعت اور جمعہ اسی کے پیچھے درست ہے جسے انہوں نے مقرر کیا اور جہاد نہیں ہو سکتا جب تک ان کی طرف سے اجازت موجود نہ ہو۔"

مقابلے کا ارادہ ترک کر دیا: ان دونوں نہایت غلطیوں کے درمیان اہلسنت ہیں وہ نہ پہلے گروہ کے ہمنوا ہیں اور نہ دوسرے گروہ کے۔ ان کا خیال ہے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ مظلوم شہید کیے گئے ان کے ہاتھ امت کی سیاسی باگ دوڑ نہیں آئی۔ علاوہ ازیں مذکورہ بالا احادیث ان پر چسپاں نہیں ہوتیں کیونکہ جب انہیں اپنے بھائی مسلم بن عقیل کا انجام معلوم ہوا تو وہ اپنے اس ارادے سے دستبردار ہو گئے ♣ تھے اور فرماتے ♣ تھے۔

"مجھے وطن جانے دو یا کسی سرحد پر مسلمانوں کی فوج سے جا ملنے دو یا خود یزید کے پاس پہنچنے دو ♣ مگر مخالفین نے ان کی کوئی بات بھی نہ مانی اور اسیری قبول کرنے پر اصرار کیا جسے انہوں نے نامنظور کر دیا کیونکہ اسے منظور کرنا ان پر شرعاً واجب نہ تھا۔

شہادت حسین کا نتیجہ

صحابہ سے بدگمانی اور بدعات محرم کا ظہور: شہادت حسین کی وجہ سے شیطان کو بدعتوں اور ضلالتوں کے پھیلانے کا موقعہ مل گیا۔ چنانچہ کچھ لوگ یوم عاشوراء میں نوحہ وماتم کرتے ہیں، منہ پیٹتے ہیں، روتے چلاتے ہیں، بھوکے پیاسے رہتے ہیں،

♣ یعنی راستے ہی سے واپس مکہ جانے کا ارادہ کر لیا تھا لیکن مسلم کے بھائیوں کے اصرار کا ساتھ دینا پڑا جیسا کہ شیعہ سنی سب تاریخوں میں ہے۔ (ص،ی)

♣ یعنی منزل مقصود پر پہنچ کر جب ابن زیاد کی فوج کے سربراہ عمر بن سعد سے گفتگوئے مصالحت کے سلسلے میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے متن میں مذکور تین باتیں فرمائیں

♣ اس تیسری بات کے بارے میں تاریخ طبری ۴/۲۹۳ میں یہ الفاظ ہیں:

((فأضع يدي في يده فيحكم في ما رأى)) (البداية: ۸/۱۷۱)

"میں براہ راست یزید کے ہاتھ میں ہاتھ رکھ دوں گا (بیعت کر لوں گا) پھر وہ جیسا کہ مناسب سمجھے کر لے گا۔"

شیخ الاسلام ابن تیمیہ نے بھی ایک جگہ یہ الفاظ ذکر کیے ہیں:

((وطلب أن يردوه إلى يزيد ابن عمه حتى يضع يده في يده أو يرجع من حيث جاء أو يلحق الثغور)) (رأس الحسين، ص:۲۰)

مطلب وہی ہے جو متن میں ہے۔ (ص،ی)

مرثیے ہیں، یہی نہیں بلکہ سلف و صحابہ کو گالیاں دیتے ہیں، لعنت کرتے ہیں، اور ان بے گناہ لوگوں کو لپیٹ لیتے ہیں جنہیں واقعات شہادت سے دور و نزدیک کا کوئی تعلق نہ تھا بلکہ ((وَالسَّابِقُونَ الأَوَّلُونَ مِنَ الْمُهَاجِرِينَ وَالأَنصَارِ)) کو بھی گالیاں دیتے ہیں پھر واقعۂ شہادت کی جو کتابیں پڑھتے ہیں وہ زیادہ تر اکاذیب واباطیل کا مجموعہ ہیں اور ان کی تصنیف واشاعت سے ان کے مصنفوں کا مقصد صرف یہ تھا کہ فتنہ کے نئے نئے دروازے کھلیں۔ اور امت میں پھوٹ بڑھتی جائے۔ یہ چیز باتفاق جملہ اہل اسلام نہ واجب ہے نہ مستحب، بلکہ اس طرح روناپیٹنا اور پرانی مصیبتوں پر گریہ وزاری کرنا اعظم ترین محرمات دینیہ میں سے ہے۔

پھر ان کے مقابلے میں دوسرا فرقہ ہے جو یوم عاشوراء میں مسرت اور خوشی کی بدعت کرتا ہے۔ کوفہ میں یہ دونوں گروہ موجود تھے۔ شیعوں کا سردار مختار بن عبید تھا اور ناصبیوں کا سر گروہ حجاج بن یوسف الثقفی تھا۔

واقعاتِ شہادت میں مبالغہ: جن لوگوں نے واقعاتِ شہادت قلم بند کیے ہیں ان میں اکثر نے بہت کچھ جھوٹ ملا دیا ہے۔ جس طرح شہادتِ عثمان رضی اللہ عنہ بیان کرنے والوں نے کیا اور جیسے مغازی وفتوحات کے راویوں کا حال ہے حتی کہ واقعاتِ شہادت کے مؤرخین میں سے بعض اہل علم مثلاً بغوی اور ابن ابی الدنیا وغیرہ بھی بے بنیاد روائتوں کا شکار ہو گئے ہیں۔ رہے وہ مصنف جو بلااسناد واقعات روایت کرتے ہیں تو ان کے ہاں جھوٹ بہت زیادہ ہے۔

دندان مبارک پر چھڑی مارنے کا واقعہ: صحیح طور پر صرف اس قدر ثابت ہے کہ جب حضرت حسین رضی اللہ عنہ شہید کیے گئے تو آپ کا سر مبارک عبیداللہ بن زیاد کے سامنے لایا گیا۔ اس نے اپ کے دانتوں پر چھڑی ماری اور آپ کے حسن کی مذمت کی۔ مجلس میں حضرت انس رضی اللہ عنہ اور ابو برزہ اسلمی رضی اللہ عنہ دو صحابی موجود تھے انس نے اس کی تردید کی اور کہا۔ "آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سب سے زیادہ مشابہت رکھتے تھے۔" صرف حضرت انس رضی اللہ عنہ ہی نہیں بلکہ اور صحابہ کو بھی آپ کی شہادت سے از حد ملال تھا۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے ایک عراقی نے پوچھا کہ حالت احرام میں مکھی کا جائز ہے؟ انہوں نے خفا ہو کر جواب دیا:

"اے اہل عراق تمہیں مکھی کی جان کا اتنا خیال ہے حالانکہ تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نواسے کو قتل کر چکے ہو۔"

بعض روائتوں میں دانتوں پر چھڑی مارنے کا واقعہ یزید کی طرف منسوب کیا گیا ہے جو بالکل غلط ہے کیونکہ جو صحابی اس واقعے میں موجود تھے وہ دمشق میں نہیں تھے عراق میں تھے۔

یزید نے حضرت حسین کے قتل کا حکم نہیں دیا: متعدد مؤرخین نے جو نقل کیا ہے وہ یہی ہے کہ یزید نے حضرت حسین ؓ کے قتل کا حکم نہیں دیا اور نہ یہ بات ہی اس کے پیش نظر تھی بلکہ وہ تو اپنے باپ معاویہ ؓ کی وصیت کے مطابق ان کی تعظیم و تکریم کرنا چاہتا تھا۔ البتہ اس کی یہ خواہش تھی کہ آپ خلافت کے مدعی ہو کر اس پر خروج نہ کریں۔ حضرت حسین ؓ جب کربلا پہنچے اور آپ کو اہل کوفہ کی بے وفائی کا یقین ہو گیا تو ہر طرح کے مطالبے سے دست بردار ہو گئے تھے۔ مگر مخالفوں کی بے وفائی کا یقین ہو گیا تو ہر طرح کے مطالبے سے دست بردار ہو گئے تھے۔ مگر مخالفوں نے نہ انہیں وطن واپس ہونے دیا، نہ جہاد پر جانے دیا اور نہ یزید کے پاس بھیجنے پر رضامند ہوئے بلکہ قید کرنا چاہا جسے آپ نے نامنظور کیا اور شہید ہو گئے۔ یزید اور اس کے خاندان کو جب یہ خبر پہنچی تو بہت رنجیدہ ہوئے اور روئے بلکہ یزید نے تو یہاں تک کہا۔

((قبح الله ابن مرجانة لو كانت بينه وبينكم رحم أو قرابة ما فعل هذا بكم)) (تاریخ الطبری: ۳۵۳/۴ والبدایۃ: ۱۹۳/۸)

"(عبیداللہ بن زیاد) پر اللہ کی پھٹکار! واللہ! اگر وہ خود حسین کا رشتہ دار ہوتا تو ہرگز قتل نہ کرتا۔"

اور کہا:

((قد كنت أرضى من طاعة أهل العراق بدون قتل الحسين))

"بغیر قتل حسین کے بھی میں اہل عراق کی اطاعت منظور کر سکتا تھا۔"

پھر اس نے حضرت حسین ؓ کے پسماندگان کی بڑی خاطر تواضع کی اور عزت کے ساتھ انہیں مدینہ واپس پہنچا دیا۔

یزید نے اہل بیت کی بے حرمتی نہیں کی: بلاشبہ یہ بھی درست ہے کہ یزید نے حضرت حسین ؓ کی طرفداری بھی نہیں کی، نہ ان کے قاتلوں کو قتل کیا نہ ان سے انتقام لیا۔ لیکن یہ کہنا بالکل سفید جھوٹ ہے کہ اس نے اہل بیت کی خواتین کو کنیز بنایا۔ ملک ملک پھرایا اور بغیر کجاوہ کے انہیں اونٹوں پر سوار کیا۔ الحمد للہ مسلمانوں نے آج تک کسی ہاشمی عورت سے یہ سلوک نہیں کیا اور نہ اسے امت محمد (ﷺ) نے کسی حال میں جائز رکھا ہے۔

حضرت حسین کو شہید کرنے کا گناہ عظیم: یہ بالکل درست ہے جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے حضرت حسین ؓ کی شہادت عظیم ترین گناہوں میں سے ایک گناہ تھی۔ جنہوں نے یہ فعل کیا، جنہوں نے اس میں مدد کی، جو اس سے خوش ہوئے وہ سب کے سب اس عتاب الٰہی کے سزاوار ہیں جو ایسے لوگوں کے لیے شریعت میں وارد ہے لیکن حسین ؓ کا قتل ان لوگوں کے قتل سے بڑھ کر نہیں جو ان سے افضل تھے۔ مثلاً انبیاء، مؤمنین اولین، شہداء یمامہ، شہداء اُحد، شہداء بئر معونہ۔ حضرت عثمان ؓ یا خود حضرت علی ؓ بلکہ حضرت علی ؓ کے قاتل تو آپ کو کافر و مرتد سمجھتے اور یقین کرتے تھے کہ آپ کا قتل عظیم ترین عبادت ہے۔ برخلاف حسین ؓ کے کہ ان کے قاتل انہیں ایسا نہیں سمجھتے تھے۔ ان میں اکثر تو آپ کے قتل کو ناپسند کرتے

اور ایک بڑا گناہ تصور کرتے تھے لیکن اپنی اغراض کی خاطر اس فعل شنیع کے مرتکب ہوئے جیسا کہ لوگ سلطنت کے لیے باہمی خونریزی کرتے ہیں۔

یزید پر لعنت بھیجنے کا مسئلہ: رہا سوال یزید پر لعنت کرنے کا تو واقعہ یہ ہے یہ ہے کہ یزید بھی بہت سے دوسرے بادشاہوں اور خلفاء جیسا ہی ہے بلکہ کئی حکمرانوں سے وہ اچھا تھا۔ وہ عراق کے امیر "مختار بن ابی عبید الثقفی" سے کہیں اچھا تھا۔ جس نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی حمایت کا علم بلند کیا۔ ان کے قاتلوں سے انتقام لیا مگر ساتھ ساتھ یہ دعوی کیا کہ جبرائیل اس کے پاس آتے ہیں، اسی طرح یزید حجاج بن یوسف سے اچھا تھا جو بلا نزاع یزید سے کہیں زیادہ ظالم تھا۔ یزید اور اس جیسے دوسرے سلاطین و خلفاء کے بارے میں زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ فاسق تھے۔

لعنت کے بارے میں مسئلہ شرعیہ: لیکن فاسق کو معین کرکے لعنت کرنا سنت نبوی ﷺ میں موجود نہیں البتہ عام لعنت وارد ہے۔ مثلاً نبی ﷺ نے فرمایا:

((لَعَنَ اللَّهُ السَّارِقَ يَسْرِقُ الْبَيْضَةَ فَتُقْطَعُ يَــدُهُ)) (صحیح البخاری، الحدود، باب لعن السارق إذا لم یسم، ح:۶۷۸۳ و صحیح مسلم، الحدود، باب حد السرقة ونصابها، ح:۱۶۸۷)

"چور پر اللہ کی لعنت کہ ایک انڈے پر اپنا ہاتھ کٹوا دیتا ہے۔"

فرمایا:

((فَمَنْ أَحْدَثَ حَدَثًا أَوْ آوَى مُحْدِثًا فَعَلَيْهِ لَعْنَةُ اللَّهِ)) (صحیح البخاری، الجزیة والموادعة، باب إثم من عاهد ثم غدر، ح:۳۱۷۹)

"جو بدعت نکالے یا بدعتی کو پناہ دے اس پر اللہ کی لعنت۔"

یا مثلاً صحیح بخاری میں ہے کہ ایک شخص شراب پیتا تھا اور بار بار نبی ﷺ کے پاس پکڑا آتا تھا یہاں تک کہ کئی پھیرے ہو چکے تو ایک شخص نے کہا:

((اللَّهُمَّ الْعَنْهُ مَا أَكْثَرَ مَا يُؤْتَى بِهِ))

"اس پر اللہ کی لعنت کہ بار بار پکڑ کر دربار رسالت میں پیش کیا جاتا ہے۔"

آنحضرت ﷺ نے سنا تو فرمایا:

((لَا تَلْعَنُوهُ فَوَاللَّهِ مَا عَلِمْتُ إِنَّهُ يُحِبُّ اللَّهَ وَرَسُولَهُ)) (صحیح البخاری، الحدود، باب ما یکرہ من لعن شارب الخمر۔، ح: ۶۷۸۰)

حالانکہ آپ نے عام طور پر شرابیوں پر لعنت بھیجی ہے۔اس سے ثابت ہوا کہ عام طور پر کسی خاص گروہ پر لعنت بھیجنا جائز ہے مگر اللہ اور رسول ﷺ سے محبت رکھنے والے کسی معین شخص پر لعنت کرنا جائز نہیں اور معلوم ہے کہ ہر مومن اللہ اور رسول سے ضرور محبت رکھتا ہے۔

یزید پر لعنت سے پہلے دو چیزوں کا اثبات ضروری ہے: صحیح حدیثوں سے ثابت ہے کہ جس کے دل میں ذرہ برابر بھی ایمان ہوگا وہ بالآخر دوزخ سے نجات پائے گا۔

بنابریں جو لوگ یزید کی لعنت پر زور دیتے ہیں انہیں دو باتیں ثابت کرنی چاہئیں۔اول یہ کہ یزید ایسے فاسقوں اور ظالموں میں سے تھا جن پر لعنت کرنا مباح ہے۔اور اپنی اس حالت پر موت تک رہا۔دوسرے یہ کہ ایسے ظالموں اور فاسقوں میں سے کسی ایک کو معین کرکے لعنت کرنا روا ہے۔رہی آیت أَلاَ لَعْنَةُ اللّهِ عَلَى الظَّالِمِينَ (ھود: ۱۱/۱۸) تو یہ عام ہے جیسا کہ باقی تمام آیات وعید عام ہیں۔اور پھر ان آیتوں سے کیا ثابت ہوتا ہے یہی کہ یہ گناہ لعنت اور عذاب کا مستوجب ہے؟ لیکن بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ دوسرے اسباب آکر لعنت و عذاب کے اسباب کو دور کر دیتے ہیں مثلاً گناہ گار نے سچے دل سے توبہ کرلی یا اس سے ایسی حسنات بن آئیں جو سیئات کو مٹا دیتی ہیں۔یا ایسے مصائب پیش آئے جو گناہوں کا کفارہ بن جاتے ہیں۔بنابریں کون شخص دعویٰ کر سکتا ہے کہ یزید اور اس جیسے بادشاہوں نے توبہ نہیں کی، یا سیئات کو دور کرنے والی حسنات انجام نہیں دیں یا گناہوں کا کفارہ ادا نہیں کیا، یا یہ کہ اللہ کسی حال میں بھی انہیں نہیں بخشے گا۔حالانکہ وہ خود فرماتا ہے:

إِنَّ اللّهَ لاَ يَغْفِرُ أَن يُشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذَلِكَ لِمَن يَشَاءُ (النساء: ۴/۴۸)

پھر صحیح بخاری میں عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا:

"سب سے پہلے قسطنطنیہ پر جو فوج لڑے گی وہ مغفور ہے۔" (صحیح البخاری، الجہاد والسیر، باب ما قیل فی قتال الروم، ح: ۲۹۲۴)

اور معلوم ہے کہ اسلام میں سب سے پہلے جس فوج نے قسطنطنیہ پر لڑائی کی اس کا سپہ سالار یزید ہی تھا۔کہا جا سکتا ہے کہ یزید نے یہ حدیث سن کر ہی فوج کشی کی ہوگی، بہت ممکن ہے کہ یہ بھی صحیح ہو لیکن اس سے اس فعل پر کوئی نکتہ چینی نہیں کی جا سکتی۔

لعنت کا دروازہ کھولنے کے نتائج: پھر ہم خوب جانتے ہیں کہ اکثر مسلمان کسی نہ کسی طرح کے ظلم سے ضرور آلودہ ہوتے ہیں اگر لعنت کا دروازہ اس طرح کھول دیا جائے تو مسلمانوں کے اکثر مردے لعنت کا شکار ہو جائیں گے حالانکہ اللہ تعالیٰ نے مردہ کے حق میں صلاۃ و دعا کا حکم دیا ہے نہ کہ لعنت کرنے کا۔

نبی ﷺ نے فرمایا ہے:

((لَا تَسُبُّوا الْأَمْوَاتَ فَإِنَّهُمْ قَدْ أَفْضَوْا إِلَى مَا قَدَّمُوا)) (صحیح البخاری، الجنائز، باب ماینھی من سب الاموات، ح:۱۳۹۳)

"مردوں کو گالی مت دو کیونکہ وہ اپنے کیے کو پہنچ گئے۔"

بلکہ جب لوگوں نے ابوجہل جیسے کفار کو گالیاں دینی شروع کیں تو انہیں منع کیا اور فرمایا:

((لَا تَسُبُّوا مَوْتَانَا فَتُؤْذُوا أَحْيَاءَنَا)) (سنن النسائی، القسامۃ، القود من اللطمۃ، ح:۴۷۷۹)

"ہمارے مرے ہوؤں کو گالیاں مت دو کیونکہ اس سے ہمارے زندوں کو تکلیف ہوتی ہے۔"

یہ اس لیے کہ قدرتی طور پر ان کے مسلمان رشتہ دار برا مانتے تھے۔ امام احمد بن حنبل سے ان کے بیٹے صالح نے کہا ألا تلعن یزید؟ آپ یزید کو لعنت کیوں نہیں کرتے؟ حضرت امام نے جواب دیا: "متیٰ رأیت أباک یلعن أحداً" تو نے اپنے باپ کو کسی پر بھی لعنت کرتے کب دیکھا تھا۔"

قرآن کریم کی آیت:

فَهَلْ عَسَيْتُمْ إِن تَوَلَّيْتُمْ أَن تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ وَتُقَطِّعُوا أَرْحَامَكُمْ ۞ أُوْلَئِكَ الَّذِينَ لَعَنَهُمُ اللَّهُ فَأَصَمَّهُمْ وَأَعْمَى أَبْصَارَهُمْ (محمد ۴۸/۲۲-۲۳)

"کیا تم سے بعید ہے کہ اگر جہاد سے پیٹھ پھیر لو تو لگو ملک میں فساد کرنے اور اپنے رشتے توڑنے یہی وہ لوگ ہیں جن پر اللہ نے لعنت کی اور ان کو بہرا اور ان کی آنکھوں کو اندھا کر دیا ہے۔"

سے خاص یزید کی لعنت پر اصرار کرنا خلاف انصاف ہے۔ کیونکہ یہ آیت عام ہے اور اس کی وعید ان تمام لوگوں کو شامل ہے جو ایسے افعال کے مرتکب ہوں جن کا اس آیت میں ذکر ہے یہ افعال صرف یزید ہی نے نہیں کیے بلکہ بہت سے ہاشمی، عباسی، علوی بھی ان کے مرتکب ہوئے ہیں۔ اگر اس آیت کی رو سے ان سب پر لعنت کرنا ضروری ہو تو اکثر مسلمانوں پر لعنت ضروری ہو جائے گی۔ کیوں کہ یہ افعال بہت عام ہیں مگر یہ فتویٰ کوئی بھی نہیں دے سکتا۔

قاتلین حسین کے متعلق روایات: رہی وہ روایت جو بیان کی جاتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: حسین رضی اللہ عنہ کا قاتل آگ کے تابوت میں ہوگا۔ اس اکیلے پر آدھی دوزخ کا عذاب ہوگا اس کے ہاتھ پاؤں آتشی زنجیروں سے جکڑے ہوں گے وہ دوزخ میں الٹا اتارا جائے گا یہاں تک کہ اس کی تہ تک پہنچ جائے گا اور اس میں اتنی سخت بدبو ہوگی کہ دوزخی تک اللہ سے پناہ مانگیں گے وہ ہمیشہ دوزخ میں پڑا جلتا رہے گا۔"

تو یہ روایت بالکل جھوٹی ہے اور ان لوگوں کی بنائی ہوئی ہے جو رسول اللہ ﷺ پر تہمت باندھنے سے نہیں شرماتے۔ کہاں آدھی دوزخ کا عذاب، اور کہاں ایک حقیر آدمی؟ فرعون اور دوسرے کفار و منافقین، قاتلین انبیاء اور قاتلین مومنین اولین کا عذاب قاتلین حسین رضی اللہ عنہ سے کہیں زیادہ سخت ہوگا بلکہ عثمان کے قاتلوں کا گناہ بھی حسین کے قاتلوں سے زیادہ ہے۔

اہل سنت کا مسلک معتدل: حسین رضی اللہ عنہ کی طرفداری میں اس غلو کا جواب ناصبیوں کا غلو ہے جو حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو اس حدیث کا مصداق قرار دے کر

((فَمَنْ أَرَادَ أَنْ يُفَرِّقَ أَمْرَ هَذِهِ الْأُمَّةِ وَهِيَ جَمِيعٌ فَاضْرِبُوهُ بِالسَّيْفِ كَائِنًا مَنْ كَانَ)) (صحیح مسلم، الإمارة، باب حکم من فرق أمر المسلمین وہو مجتمع، ح:۱۸۵۲)

انہیں باغی اور واجب القتل قرار دیتے ہیں۔ لیکن اہل سنت والجماعت نہ اس کا ساتھ دیتے ہیں نہ اس غلو کا۔ بلکہ یہ کہتے ہیں کہ حضرت حسین مظلوم شہید ہوئے اور ان کے قاتل ظالم و سرکش تھے۔ اور ان احادیث کا اطلاق ان پر صحیح نہیں جن میں تفریق بین المسلمین کرنے والے کے قتل کا حکم دیا گیا ہے کیونکہ کربلا میں آپ کا قصد امت میں پھوٹ ڈالنا نہ تھا، بلکہ آپ جماعت ہی میں رہنا چاہتے تھے مگر ظالموں نے آپ کا کوئی مطالبہ نہ مانا، نہ آپ کو وطن واپس ہونے دیا، نہ سرحد پر جانے دیا۔ نہ خود یزید کے پاس پہنچنے دیا بلکہ قید کرنے پر اصرار کیا۔ ایک معمولی مسلمان بھی اس برتاؤ کا مستحق نہیں ہو سکتا کجا کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ۔

اسی طرح یہ روایت بھی رسول اللہ ﷺ پر سفید جھوٹ ہے۔

"جس نے میرے اہل بیت کا خون بہایا اور میرے خاندان کو اذیت دے کر مجھے تکلیف پہنچائی اس پر اللہ کا اور میرا غصہ ہوگا۔"

اس طرح کی بات رسول اللہ ﷺ کی زبان مبارک سے کہیں بھی نہیں نکل سکتی تھی۔ کیونکہ رشتہ داری اور قرابت سے زیادہ ایمان اور تقویٰ کی حرمت ہے اگر اہل بیت میں سے کوئی ایسا شخص جرم کرے جس پر شرعاً اس کا قتل واجب ہو تو بالاتفاق اسے قتل کر ڈالا جائے گا۔ مثلاً اگر کوئی ہاشمی چوری کرے تو یقیناً اس کا ہاتھ کاٹا جائے گا۔ اگر زنا کا مرتکب ہو تو سنگسار کر دیا جائے گا۔ اگر جان بوجھ کر کسی بے گناہ کو قتل کر ڈالے تو قصاص میں اس کی بھی گردن ماری جائے گی۔ اگرچہ مقتول حبشی، رومی، ترکی دیلمی غرض کوئی بھی ہو۔ کیونکہ نبی ﷺ نے فرمایا:

((الْمُسْلِمُونَ تَتَكَافَأُ دِمَاؤُهُمْ)) (سنن أبی داؤد، الجهاد، باب فی السریۃ۔۔۔، ح:۲۷۵۱)

"یعنی تمام مسلمانوں کا خون یکساں حرمت رکھتا ہے۔"

پس ہاشمی و غیر ہاشمی کا خون برابر ہے۔

اسلامی مساوات:

نیز فرمایا:

((إِنَّمَا أَهْلَكَ الَّذِينَ قَبْلَكُمْ أَنَّهُمْ كَانُوا إِذَا سَرَقَ فِيهِمْ الشَّرِيفُ تَرَكُوهُ وَإِذَا سَرَقَ فِيهِمْ الضَّعِيفُ أَقَامُوا عَلَيْهِ الْحَدَّ وَايْمُ اللَّهِ لَوْ أَنَّ فَاطِمَةَ بِنْتَ مُحَمَّدٍ سَرَقَتْ لَقَطَعْتُ يَدَهَا)) (صحیح البخاری، أحادیث الأنبیاء، باب:۵۴، ح:۳۴۷۵ و صحیح مسلم، الحدود، باب قطع السارق الشریف وغیرہ۔۔۔، ح:۱۶۸۸)

"اگلی قومیں اس طرح ہلاک ہوئیں کہ جب ان میں کوئی معزز آدمی چوری کرتا تو چھوڑ دیا جاتا تھا۔ لیکن جب معمولی آدمی جرم کرتا تو اسے سزا دی جاتی تھی۔ واللہ! اگر فاطمہ بنت محمد ﷺ بھی چوری کرے تو میں اس کا ہاتھ کاٹ ڈالوں گا۔"

اس میں نبی ﷺ نے تشریح کر دی ہے کہ اگر آپ کا قریب سے قریب عزیز بھی جرم سے آلودہ ہوگا تو اسے شرعی سزا ضرور ملے گی۔

کسی خاندان کی خصوصیت ثابت نہیں: پھر یہ کیسے باور کیا جا سکتا ہے کہ نبی ﷺ یہ کہہ کر اپنے خاندان کو خصوصیت دیں کہ جو ان کا خون بہائے گا۔ اس پر اللہ کا غصہ بھڑکے گا۔ کیونکہ یہ بات پہلے ہی مسلم ہے کہ ناحق قتل شریعت میں حرام ہے، عام اس سے کہ ہاشمی کا ہو یا غیر ہاشمی کا:

وَمَن يَقْتُلْ مُؤْمِناً مُّتَعَمِّداً فَجَزَآؤُهُ جَهَنَّمُ خَالِداً فِيهَا وَغَضِبَ اللّهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهُ وَأَعَدَّ لَهُ عَذَاباً عَظِيماً (النساء ۹۳/۴)

پس قتل کی اباحت و حرمت میں ہاشمی و غیر ہاشمی، سب مسلمان یکساں درجہ رکھتے ہیں۔

اسی طرح رسول اللہ ﷺ کو تکلیف دینا حرام ہے عام اس سے کہ آپ کے خاندان کو تکلیف دے کر ہو یا امت کو ستا کر، یا سنت کو توڑ کر۔ اب واضح ہو گیا کہ اس طرح کی بے بنیاد حدیثیں جاہلوں اور منافقوں کے سوا کوئی اور نہیں بیان کر سکتا۔

اسی طرح یہ کہنا کہ رسول اللہ ﷺ حضرت حسن رضی اللہ عنہ اور حسین رضی اللہ عنہ سے نیک سلوک کی مسلمانوں کو ہمیشہ وصیت کرتے اور فرماتے تھے۔ "یہ تمہارے پاس میری امانت ہیں۔" بالکل غلط ہے۔

بلاشبہ حضرت حسن و حسین اہل بیت میں بڑا درجہ رکھتے ہیں لیکن نبی ﷺ نے یہ کبھی نہیں فرمایا کہ "حسنین تمہارے پاس میری امانت ہیں۔" رسول اللہ ﷺ کا مقام اس سے کہیں ارفع و اعلیٰ ہے کہ اپنی اولاد مخلوق کو سونپیں۔

ایسا کہنے کے دو ہی مطلب ہو سکتے ہیں۔

۱۔ یہ کہ جس طرح مال امانت رکھا جاتاہے اور اس کی حفاظت مقصود ہوتی ہے تو یہ صورت تو ہو نہیں سکتی کیونکہ مال کی طرح آدمی امانت رکھے نہیں جا سکتے۔

۲۔ یا یہ مطلب ہو گا کہ جس طرح بچوں کو مربیوں کے سپرد کیا جاتاہے۔ تو یہ صورت بھی یہاں درست نہیں ہو سکتی کیونکہ بچپن میں حسنین اپنے والدین کی گود میں تھے۔ اور جب بالغ ہوئے تو اور سب آدمیوں کی طرح خود مختار اور اپنے ذمہ دار ہو گئے۔

اگر یہ مطلب بیان کیا جائے کہ نبی ﷺ نے امت کو ان کی حفاظت و حراست کا حکم دیا تھا تو یہ بھی درست نہیں کیونکہ امت کسی کو مصیبت سے بچا نہیں سکتی۔ وہ صرف اللہ ہی ہے جو اپنے بندوں کی حفاظت کرتا ہے۔

اگر کہا جائے کہ اس سے آپ کی غرض ان کی حمایت و نصرت تھی۔ تو اس میں ان کی خصوصیت نہیں۔ ہر مسلمان کو دوسرے مظلوم مسلمان کی حمایت و نصرت کرنی چاہیے اور ظاہر ہے حسنین اس کے زیادہ مستحق ہیں۔

اسی طرح یہ کہنا کہ آیت:

قُل لَّا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْراً إِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبَى (الشوری ۴۲/۲۳)

"میں تم سے کوئی مزدوری نہیں مانگتا ہوں صرف رشتہ داری کی محبت چاہتا ہوں۔"

حسنین کے بارے میں نازل ہوئی ہے، بالکل جھوٹ ہے کیونکہ یہ آیت سورۃ شوری کی ہے اور سورۂ شوری مکی ہے اور حسنین کیا معنی؟ حضرت فاطمہ کی شادی سے بھی پہلے اتری ہے۔ آپ کا عقد ہجرت کے دوسرے سال مدینہ میں ہوا اور حسن و حسین ہجرت کے تیسرے اور چوتھے سال پیدا ہوئے۔ پھر یہ کہنا کیسے صحیح ہو سکتا ہے کہ آیت ان کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔؟ (منہاج السنہ از صفحہ: ۲۳۷تا۲۵۶، ج: ۲، طبع قدیم)

   